eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

ڈاکٹر شیراز فضل داد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
ماریہ ترمذی
ٹیچنگ اینڈ ریسرچ ایسوسی ایٹ، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر غلام فریدہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Dr Shiraz Fazal Dad **Email:** shiraz.fazal@iiu.edu.pk
Assistant Professor, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad
Ms Maria Termizi **Email:** maria.termezi@iiu.edu.pk
Teaching and Research Associate Urdu, International Islamic University, Islamabad
Dr Ghulam Farida **Email:** ghulam.farida@iiu.edu.pk
Assistant Professor, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad

تاریخی اور سیاسی تناظر میں ناول "صدیوں کی زنجیر" کا مطالعہ

A STUDY OF THE NOVEL "SADION KI ZANJEER" IN HISTORICAL AND SOCIAL CONTEXT

DOI: https://doi.org/10.56276/tasdiq.v4i01.90

ABSTRACT

Razia Fasih Ahmed is an important contemporary writer. He has a keen eye for the changes taking place in society. *Sadion ki Zanjeer* is one of his most important novels written in the context of “Fall of Dhaka”. In this novel, he presented the historical facts regarding the tragedy of East Pakistan in three periods namely “manzar”,”pasmanzar” and “paish manzar”. After the Fall of Dhaka, the people of East Pakistan, who were suffering from misconceptions about independence, realized that it was a conspiracy. The author has stated all these facts very clearly in this novel. He also described the wrong decisions taken by West Pakistan at the political and economic levels. This novel is also an excellent account of the cultural situation of East Pakistan. In this article, the incident of “Fall of Dhaka” has been presented as a historical tragedy because of the mental and psychological conditions of the characters.

KEYWORDS
Razia Fasih,
East Pakistan,
Bangladesh,
Bengal,
Khilji Family,
Two Nation Ideology,
Shams Ur Rehman,
Zari Khan,
Fall Of Dhaka,
Thirteenth Century

Received:05-Jun-22
Accepted:20-Jun-22
Online: 30-Jun-22

کلیدی الفاظ: رضیہ فصیح، مشرقی پاکستان، صدیوں کی زنجیر، تیرھویں صدی، خلجی خاندان، سقوط ڈھاکہ، دو قومی نظریہ، بنگال، شمس الرحمن، زری خان

رضیہ فصیح احمد کا شمار ان خواتین مصنفین میں ہوتا ہے جو شعر و نثر کی مختلف اصناف کا قابل قدر تجربہ رکھتی ہیں۔ اگرچہ مصنفہ طویل عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں مگر ان کی تحریروں میں باخوبی مشرق کی ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ مشرقی معاشرے کا حساس انسان کی طرح مطالعہ کرتی ہیں، سیاسی و سماجی تبدیلیوں پر معاشرے کے باشعور فرد کی طرح نگاہ رکھتی ہیں اور ایک ذمہ دار ادیب کی طرح انھیں اپنی تحریروں کا حصہ بناتی ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں انھوں نے پندرہ ناول تحریر کیے ہیں، جن میں ایوارڈ یافتہ ناول آبلہ پا بھی شامل ہے۔ ان کے ناول سیاسی بیداری اور سماجی شعور کے عکاس ہیں۔ افراد کی خانگی زندگیوں کی کہانیاں تحریر کرتے ہوئے سیاسی منظر نامے کو فراموش نہیں کرتیں۔ بل کہ یوں کہا جائے تو درست ہو گا کہ ان کے ناولوں میں سیاسی حالات اور افراد کی خانگی زندگیاں متوازی چلتی نظر آتی ہیں۔ بقول غلام محی الدین انصاری:

> رضیہ فصیح احمد پاکستان کی معاشرتی زندگی کی گہرائیوں میں دوغلاپن اور دوہرے نظریات کی مضبوطیوں کو اکھاڑ پھینکنے کی شدید خواہاں ہیں، جو مرد و زن کو دو الگ الگ طبقوں کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرد کا طبقہ ہر نقطۂ نظر سے بالا دستی اور حاکمیت کی عکاسی کرتا ہے۔ جب کہ آزادی اور بنیادی ضرورتوں کی خواہش مند طبقۂ نسواں کے جذبات کچل دیے جاتے ہیں۔ 1
>
> "صدیوں کی زنجیر" رضیہ فصیح احمد کا ایک طویل ناول ہے۔ یہ ناول ۱۹۸۶ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ عنوان صدیوں کی زنجیر سے مراد دراصل وقت کی وہ زنجیر ہے جو نسلوں کو آپس میں جوڑے ہوئے ہے۔ "مشرقی پاکستان کو ہم نے مجبور کیا کہ وہ ہم سے الگ ہو جائے۔ اس نازک موضوع پر انھوں نے ایک ناول 'صدیوں کی زنجیر' لکھا۔"2

ناول تیرھویں صدی میں خلجی خاندان کی مہم جوئی کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ بعد ازاں برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کے دو اہم سیاسی ادوار اور ان سے متاثرہ انسانوں کو موضوع بناتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی سیاسی صورت حال کو مختصر مگر جامع انداز میں دکھایا گیا ہے جب کہ ناول کا بڑا حصہ سقوط ڈھاکہ پر محیط ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہو گا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علیحدگی اس کے بنیادی موضوعات ہیں۔ ناول کی کہانی اس انداز میں بُنی گئی ہے کہ یہ صرف مشرقی و مغربی پاکستانی کی علیحدگی کا سانحہ نہیں رہتا بلکہ ناول کے نظریاتی سوال اٹھاتے ہیں یوں یہ ناول زخم خوردہ انسانی زندگی کا المیہ بن جاتا ہے۔

مصنفہ نے ۱۹۶۵ء اور اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ ان دو دوروں میں انھیں بنگال کے حالات اور افراد کے رویوں میں واضح فرق محسوس ہوا۔ رویوں کا یہی فرق ناول لکھنے کا محرک بنا۔ بعد ازاں جب ناول لکھنے کا ارادہ کیا تو مزید مشاہدہ کرنے کے لیے ۱۹۸۵ء میں بنگلہ دیش کا دورہ کیا۔ چنانچہ اس آزادی کی حقیقت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی جس کے لیے ۱۹۷۱ء میں خونی انقلاب ناگزیر ہو گیا تھا۔ ناول کا پلاٹ تین باہم مربوط حصوں میں منقسم ہے۔ منظر، پس منظر اور پیش منظر۔ منظر میں ان حالات و واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے جو سقوط ڈھاکہ کے سانحہ سے قبل مشرقی پاکستان میں رونما ہو رہے تھے۔ جہاں تک کرداروں کی انفرادی زندگی کا تعلق ہے، مصنفہ نے ان کرداروں کی مختلف تحریکوں اور نظریات سے وابستگی اور پھر سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں ان نظریاتی گروہوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول ڈاکٹر ولی محمد:

> کہانی کے آغاز ہی میں ہمیں اس حبس کے آثار دکھائی دیتے ہیں جس کی روشنی میں بھیانک مستقبل کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ بنگالی سماج دو واضح دھاروں میں بٹا ہوا ہے۔ جس پر غالب لہر اس نسل کی ہے جو تخلیق پاکستان کے بعد

پیدا ہوئی اور جن کی سوچ ان بنگالی نسل پرستوں کے زیرِ اثر پروان چڑھی ہے جن کی سرکردگی اور نمائندگی شیخ مجیب اور ان کی جماعت عوامی لیگ کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ اسلام پرستوں اور پاکستان پرستوں کی بچی کچی نسل بھی ہے جن کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہیں اور وہ نسل پرستی کے تحت پروان چڑھنے والی سوچ کو اسلام کے متضاد تصور کرتی اور بنگالی نیشنلزم کی مخالفت پر کمربستہ ہے۔3

پس منظر میں ناول کے کرداروں کے ماضی میں جھانکا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس حصے میں کردار مغربی پاکستان میں موجود نظر آتے ہیں۔ اسی حصے میں مختلف کرداروں کی کہانی بیان کرتے ہوئے مصنفہ نے ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان اور اس سے قبل کے حالات کو پیش کیا ہے۔ پیش منظر میں بنگلہ دیش کے قیام، ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے نتائج کا احوال بیان ہوا ہے۔ ناول کے ان تینوں حصوں میں مصنفہ کے یکے بعد دیگرے کیے گئے پاکستان کے دوروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ تینوں دوروں میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے جو محرکات نظر آئے ان میں سے سب سے بڑی شازش ہمسائیہ دشمن ملک کی پھیلائی گئی غلط فہمیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستان کے اداروں کا غیر محتاط اور غیر سنجیدہ رویہ بھی ہے۔ اس حوالے سے حکومتی اداروں کی طرف سے جو غلطیاں ہوئیں اس حوالے سے صدیق سالک اپنی کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" میں لکھتے ہیں:

بنگالیوں کا کوٹہ دگنا کرنے کا کیا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتے ہو؟ چھوڑو اس کو۔ کیونکہ اگر صدر کے حکم پر سو فیصد عمل ہو جائے تو بھی افواجِ پاکستان میں بنگالیوں کی تعداد بمشکل پندرہ فیصد ہو جائے گی۔ حالانکہ وہ قومی آبادی کا ۵۶ فیصد ہیں۔4

اس طرح کی تمام باتیں بظاہر اتنی غیر اہم محسوس ہوتی ہیں تاہم اُن حالات کے تناظر میں یہی جملے زہرِ قاتل ثابت ہوئے۔ مصنفہ نے ناول میں اس طرح کی تمام غلط فہمیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ تین مختلف حصوں پر مشتمل اس پلاٹ میں کمال کا ربط موجود ہے جو کرداروں کی زندگی کے تسلسل کو بیان کرتا ہے۔ یہی ربط اور تسلسل قاری کو ناول کے مطالعے سے جوڑے رکھتا ہے۔ پلاٹ میں کہیں کوئی جھول یا خلا نظر نہیں آتا یہاں تک کہ مصنفہ نے اس بات کا اہتمام بھی کیا ہے کہ مرکزی کرداروں کے علاوہ ناول میں موجود ضمنی کرداروں کی زندگی کی جھلکیاں بھی تینوں حصوں میں کسی نہ کسی صورت نظر آتی رہیں۔ مرکزی کرداروں سے براہ راست منسلک شاید ہی کوئی ایسا کردار ہو جو قاری کو تینوں حصوں میں نظر نہ آئے۔

ناول میں کچھ اہم، اور کچھ غیر اہم کردار بھی ہیں تاہم مرد اور خواتین کرداروں کا تناسب تقریباً برابر ہے۔ ناول کے تمام کردار اپنی مختلف وابستگیوں کے باعث ناول میں اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ یہ کردار مختلف زبانیں بولنے والے ہیں، ان کے علاقے مختلف ہیں، ان کے زندگی گزارنے کے نظریوں میں فرق ہے، سیاسی حوالوں سے ان کی حمایت متضاد گروہوں کے ساتھ ہے۔ طبقوں، زبانوں، علاقوں، نظریوں، رنگوں کے اختلاف کے باوجود ناول کے سب کرداروں میں ایک مشترک عنصر قوت عمل ہے۔ ناول کے تقریباً سب ہی کردار حرکت و عمل کے جذبے سے مزین ہیں۔ نا وہ کسی واعظ کی طرح صرف لمبی لمبی سیاسی تقریریں کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور نہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے اپنی تقدیر بدلنے کے لیے آنے والے مسیحا کے انتظار میں ہیں، بل کہ تاریخی تبدیلیوں میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے ہر دم تیار ہیں۔

ناول کے مرکزی کردار شمس الرحمن اور زری خان ہیں۔ شمس الرحمن کا تعلق مشرقی پاکستان سے جب کہ زری کا تعلق

مغربی پاکستان سے ہے۔ زری خاں کا کردار نسائی شعور کی حامل ایک حساس تعلیم یافتہ، مہذب اور پُر اعتماد شخصیت کی مالک لڑکی کا کردار ہے جو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خودداری پر سمجھوتہ نہیں کرتی۔ یہ شمس الرحمن سے شادی کر کے مشرقی پاکستان منتقل ہو جاتی ہے۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں یک جہتی کی کوشش میں سرگرداں یہ دونوں کردار سقوط ڈھاکہ کے نتائج میں اپنی گھائل روحوں پر زخم لے کر الگ راستوں پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ ناول کے دیگر نسائی کرداروں میں بینو، پیٹل، نیلی، شیزی، ڈیزی، پاول، نرگس، زیب قادری اور قدسیہ وغیرہ شامل ہیں۔ ناول کے یہ تمام نسائی کردار کسی حد تک اپنے حلقوں میں مجبور ہونے کے باوجود باشعور ہیں۔ یہاں تک کہ نیلی کے کردار کے پس منظر میں ایک بچی کا کردار ہے مگر وہ اس قدر باشعور کردار ہے کہ اپنی غریب دوست کا ساتھ دینے کے لیے گھر والوں سے چھپ کر ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے خلاف احتجاجی جلوس میں شرکت کرتی ہے۔ ناول میں پیش کیے گئے نسائی کرداروں میں سے اکثریت تعلیم یافتہ، مہذب اور باشعور کرداروں کی ہے۔ البتہ گل جان اور مسز احسن کے رویے میں روایتی گھریلو خواتین کی جھلک نظر آتی ہے۔

ناول کا مرد مرکزی کردار شمس الرحمن ہے مگر عمر خاں المعروف "چاچاجی" کو اس ناول کا اہم ترین مرد کردار تصور کیا جانا چاہیے۔ یہ سب سے زیادہ متحرک اور جاندار مرد کردار ہے۔ ہر اعتبار سے یہ کردار زری خاں کے برابر کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ مصنفہ نے اس کردار کے توسط سے فلسفہ حیات و ممات، تسخیر کائنات اور بقائے نسل انسانی سمیت ملک کی سیاسی و سماجی صورت حال سے متعلقہ موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ عمر خاں ایک باشعور کردار ہے جو مردانہ شان کے ساتھ فیصلے لیتا ہے اور ناول کے اختتام تک انھیں نبھاتا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر دانشمندانہ سمجھوتے کے لیے تیار اس کردار کی زندگی ناول میں موجود مولانا کا کردار انسانیت کی معراج پر نظر آتا ہے۔ یہ ایک بنگالی استاد کا کردار ہے جو اعلیٰ درجے کے خیالات کا مالک ہے۔ صوفیانہ فکر کا اظہار اسی کردار کے توسط سے ہوتا ہے۔ یہ کردار بلا تخصیص رنگ و نسل تمام انسانوں کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے۔ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرتا ہے۔ کچھ اسی نوعیت کے مثبت کردار خوش حال خاں اور میجر تجمل کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ شمس الرحمن ناول کی مرکزی کہانی کا مرکزی کردار ہے جو ملک و قوم کے لیے مثبت سوچ رکھتا ہے۔ آغاز میں متحدہ پاکستان اور قومی یکجہتی کا داعی نظر آتا ہے مگر اختتام تک مشرقی و مغربی پاکستان کی علیحدگی کو جائز قرار دینے لگتا ہے۔ رونجھو، اکرام الحق اور میلو اپنے مخصوص نظریے پر قائم کردار ہیں۔ ناصر خاں اور اعجاز کے کردار معاشرے کے عام افراد کے کردار ہیں جو زندگی کے کسی لمحے پر کمزور پڑ جاتے ہیں اور کبھی جذباتیت انھیں مضبوط کر دیتی ہے۔ شہروز اور عدنان کے کردار مشرقی معاشرے کے ظالم اور عورت کا استحصال کرنے والے کرداروں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کے علاوہ بھی ناول میں بہت سے ایسے کردار ہیں جو مختلف کہانیوں میں رنگ بھرنے کا کام سرانجام دیتے ہیں اور معاشرے کی تہذیبی و سیاسی تصویر کے نقش واضح کرتے ہیں۔ اس ناول کے کرداروں کی ایک خاصیت یہ ہے ان کو مثبت یا منفی کی تقسیم میں بانٹا نہیں جاسکتا۔ یہ کردار اپنے نظریات کا دفاع کرتے ہیں اور اپنی وابستگیوں کا احترام کرتے ہوئے اقدام اٹھاتے ہیں۔ ان کے رویے سیاسی و سماجی صورت حال سے متاثر ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ناول کے زیادہ تر کردار تعلیم یافتہ اور باشعور ہیں جن کی سوچ اور عمل سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی زندگیاں خط مستقیم میں چلتی نظر نہیں آتیں بل کہ ہر موڑ پر بل کھاتی، نیا رخ لیتی نظر آتی ہیں۔ (تخیل کی سطح پر سیاسی حالات و واقعات سے پرندوں کی متاثر ہوتی ہوئی زندگیوں کو مینا اور ہریل کے کردار

کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ علامتی کردار ہے انھیں جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک برتتے ہوئے ناول کا حصہ بنایا گیا ہے۔ البتہ ان سب کرداروں کے سوا ناول میں مصنفہ کے پیش کردہ بے لوث ہمدردی کے جذبے سے لبریز انگریزوں کے ضمنی کردار قاری کے ذہن میں کچھ سوالات کو جنم دیتے ہیں۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علیحدگی کا المناک سانحہ اس ناول کا مرکزی موضوع ہے۔ مصنفہ نے مشرقی و مغربی پاکستان کے سیاسی مسائل، جغرافیائی تفاوت، نظریاتی افتراقات پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اور ان محرکات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے جو سقوط ڈھاکہ کے سانحے کا موجب بنے۔ دو قومی نظریے کو بنیاد بناتے ہوئے برصغیر کی مسلم قوم نے مل کر جدوجہد آزادی میں حصہ ڈالا اور قیام پاکستان کے خواب کو عملی تعبیر کا جامہ پہنایا۔ ناول میں ان محرکات کو زیر بحث لایا گیا جن کے باعث دو دہائیوں میں ایک نظریے سے بندھے لوگ متضاد نظریاتی دھاروں کے نمائندے بن گئے۔ ان میں سے ایک محرک عدم اعتماد کی فضا نظر آتی ہے کہ مشرقی پاکستان کی عوام مغربی پاکستان میں اٹھائے جانے والے سب اقدامات کو شک کی نظر سے دیکھنے لگی تھی۔ مصنفہ نے بین السطور عدم اعتماد کی فضا کو ہوا دینے میں بھارت کے کردار کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مغربی پاکستان کو نقصان پہنچایا مگر آبادی سے دور مشرقی پاکستان کے ساحلوں پر بمباری کر کے یہ پیغام دیتے رہے کہ بنگالی قوم سے انھیں کوئی مخاصمت نہیں۔ زبان کا فرق ملک کے دونوں حصوں میں نظریاتی فرق کی صورت اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ جب فسادات شروع ہوئے تو قتل عام صرف بولی جانے والی زبان کی بنیاد پر کیا جانے لگا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں میں یہ خیال سرایت کر گیا تھا کہ معاشی طور پر ان کے ساتھ ناانصافی کی جارہی ہے۔ یہ ایک عام خیال تھا کہ مغربی پاکستان میں دارالحکومت اسلام آباد کی تعمیر پٹ سن کی فروخت سے حاصل ہونے والے پیسے سے کی جارہی ہے مگر جہاں پٹ سن پیدا ہوتا ہے وہاں ترقیاتی کام نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حکومت کے خلاف مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں حصوں میں احتجاج کیا جارہا تھا مگر مشرقی پاکستان میں یہ احتجاج بغاوت کی صورت اختیار کرتا جارہا تھا۔ ہندوستان نے اس سے بروقت فائدہ اٹھایا اور مشرقی پاکستانیوں کے دلوں میں اپنے لیے سافٹ کارنر پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۵۶ء میں پاک فوج کے کمانڈر ان چیف ایوب خان نے کہا تھا:

The defence of East Pakistan does not lie in that part of the country.So long as the Western base in not strong, it remains indefensible. Eventually, in the 1965 war with India, East Pakistan was left defenceless. 5

حالات کی سنگینی کا یہ عالم تھا کہ اردو بولنے والوں کو سرِ عام قتل کیا جارہا تھا۔ کافی عرصے تک فوج صرف مقتولین کی لاشوں کو وصول کرنے کا کام سرانجام دیتی رہی مگر جب قتل عام حد سے تجاوز کر گیا تو ایسے میں حکومت کے پاس فوج کو حرکت میں لانے کے سوا کوئی حل نہ تھا۔ ایک طرف حکومتی احکامات پر عمل ردآمد کرتے ہوئے پاکستانی فوج نے بنگالیوں پر اپنی گرفت کو مضبوط کیا، انھیں ان کی ریشہ دوانیوں پر سزائیں دیں۔ دوسری جانب اردو زبان بولنے والوں پر زندگی تنگ کر دی گئی۔ مکتی باہنی کی جانب سے دفتروں اور شاہراہوں پر قتلِ عوام اور قتل خواص کے دل دہلا دینے والے واقعات روز کا معمول بن گئے تھے۔

> پٹھان موجود نہیں تھا۔ البتہ سنگین سے نکالی گئی اس کی آنکھیں نالی میں پڑی بٹ بٹ آسمان کی طرف تک رہی تھیں۔۔۔اس کو مار کے خون نالی مین بہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔6

اس سانحے کے پس منظر میں ناول میں پاکستان کی سماجی و تہذیبی زندگی کے موضوعات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ناول میں زندگی ہر روز ایک نیا موڑ مڑتی دکھائی گئی ہے جس کی ہر ساعت افراد کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کہیں سیاست رشتہ داروں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتی ہے اور کہیں دو محبت کرنے والوں کے درمیان کبھی ختم نہ ہونے والے فاصلوں کو جگہ دے دیتی ہے۔ شمس اور زری کی اعتماد سے بھرپور محبت کا انجام کبھی نہ ختم ہونے والے ہجر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ دونوں کردار اپنی محبت میں مخلص ہونے کے باوجود ہجر کی آگ میں جلنے پر مجبور ہیں۔ بقول ڈاکٹر۔ ایس۔ کے۔ جبیں:

> انھوں نے اوائل عمر میں ہی دو اہم سیاسی و معاشرتی انقلابات کا اثر دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے لے کر آزادیٔ ہند تک جو آٹھ نو سال گزرے ہیں وہ برصغیر کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دینے کے اعتبار سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ رضیہ کے ادبی شعور نے اسی دور میں آنکھیں کھولی ہیں۔ 7

ناول میں مشرقی معاشرے میں عورت کے استحصال کو بھی موضوع بتایا گیا ہے۔ مصنفہ نے مختلف نسائی کرداروں کے توسط سے اس معاشرے میں جسمانی، نفسیاتی اور جذباتی سطح پر عورت کے استحصال کا ذکر کیا ہے۔ سیاست ان کے خوابوں کے محل تباہ کرتی ہے تو سماج انھیں ان کے فیصلوں کے حق سے محروم کر دیتا ہے۔ عورت کے لیے اپنی عزت کا تحفظ جنگ اور امن دونوں حالتوں میں سوالیہ نشان بنا دکھائی دیتا ہے۔ عورت پر شک کرنا، غیرت کے نام پر اس کا قتل کرنا یا محبت کے نام پر اس کا جسمانی تصرف کرنا پدرسری معاشرے میں ایک معمولی بات ہے۔ عورت بیوی ہو یا محبوبہ مرد اس پر شک کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ قدسیہ ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہونے کے باوجود اپنی زندگی کے فیصلوں میں آزاد نظر نہیں آتی اور پھر عمر کا ایک بڑا حصہ نا کردہ جرم کی سزا بھگتنے میں گزار دیتی ہے۔ معاملہ سیاسی و نظریاتی اختلاف کا ہو یا نہ ہو ہر زمانے میں عورت مرد کی ہوس کا شکار نظر آتی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت اور بعد میں سقوط ڈھاکہ کی لوٹ مار میں ہونے والے عصمت دری کے واقعات انتقامی کاروائیوں سے زیادہ ظالم مردوں کی جبلی ہوس کے عکاس ہیں۔ مصنفہ نے مشرقی معاشرے کے ان تاریک پہلوؤں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کے لیے تعلیم و ترقی کے مواقع کم ہیں۔ ناول میں بیواؤں اور غریب عورتوں کے مسائل کا ذکر بھی کیا گیا ہے مگر عورتوں کے اس استحصال میں مشرقی معاشرے کے تمام مردوں کو ایک ہی صف میں کھڑا نہیں کیا گیا۔ چچا عمر کا کردار خواتین کے ساتھ ہونے والی معاشرتی ناانصافیوں کو نا صرف شدت سے محسوس کرتا ہے بلکہ اپنی بیوہ چچی کو ان کا حق دلوانے میں مدد کرتا ہے۔ زیب قادری کو نکاح کر کے معاشرے میں عزت کا مقام دلواتا ہے بل کہ عورت کا استحصال کرنے والے مردوں کو سرزنش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح مولانا کا کردار بغیر کسی رشتے کے شائستہ اور اس کی بیٹی کی مشکل ترین حالات میں حفاظت کرتا ہے۔ خونی انقلاب کے دنوں میں جان کی پرواہ کیے بغیر عورتوں اور بچوں کی عزت اور جان کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے۔

ہجرت بھی ناول کا ایک اہم موضوع ہے۔ ناول میں دوہری ہجرت کو نوع انسانی کے المیے کے طور پر دکھایا گیا ہے جو لوگ پہلے ہندوستان کو چھوڑ کر مشرقی پاکستان میں سکونت پذیر ہوئے انھیں ہجرت کے دوہرے کرب سے گزرنا پڑا۔ مگر وہاں کی فضا بھی ان کے موافق نہ رہی اور یوں انھیں ایک بار پھر اپنی جگہ چھوڑ کر نئی جگہ جانا پڑا۔ نسل انسانی کی افزائش کے لیے مصنفہ ہجرت کو ایک ناگزیر عمل تصور کرتی ہیں مگر موجودہ دنیا میں غیر متوقع حالات کے نتیجے میں ہونے والی ہجرتوں کے درد کو دل سے محسوس کرتی ہیں۔

قدرت بیجوں کے لیے جو کام ہوا سے لیتی ہے وہ کام نسلوں کی ہجرت سے ہوتا ہے، کبھی معاشی، کبھی سیاسی حالت کی وجہ سے لوگ ہجرت کرتے ہیں، نئی جگہ جاتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے لوگ لیتے ہیں، یوں نسلوں کے اختلاط سے بڑھنے، پھلنے اور پھولنے کا عمل جاری رہتا ہے۔8

وسیع پلاٹ کے حامل اس ناول میں مصنفہ نے بڑے نپے تلے الفاظ میں فلسفہ محبت بیان کیا گیا ہے۔ محبت کے تعلق کے لیے غیر مشروط بھروسے کی شرط عائد کی ہے۔ جس سے محبت کی جاتی ہے اس کے متعلق نہ دل میں گمان کو جگہ دی جاتی ہے اور نہ نگاہوں میں شک اور نہ زبان پر سوال لایا جاتا ہے۔ ناول میں زری ایک جگہ اپنے اور شمس کے بیچ حائل ہونے والے فاصلوں کو محسوس کرتے ہوئے بے انتہا درد کے ساتھ سوچتی ہے۔

اس نے سوچا، چیخنے چلانے سے محبتوں کے اڑ جانے والے پرندلوٹ تھوڑا ہی آتے ہیں۔۔۔ کبھی ہتھیار نہیں ڈالے تو اب کیسے ڈال دیں۔9

رضیہ فصیح نے اس ناول میں نسل اور قومیت کے تصور پر بھی سوال اٹھایا ہے۔ قوم کی تعریف ہر دور میں افراد کے مقاصد کے اعتبار سے بدلتی رہی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ایک مذہب سے تعلق رکھنے والوں کو ایک قوم تصور کیا گیا۔ پھر ۱۹۷۱ء کے سانحہ میں قوم کا تصور بدلا اور علاقے کو قومیت کا نام دیا گیا۔ وہ نسل جس کے آباؤ اجداد ہجرت کر کے بنگلہ دیش آ گئے تھے، وہ جن کی پیدائش ہی بنگلہ دیش میں ہوئی تھی ان سب سے بنگالی کہلانے کا حق چھین لیا گیا۔ صرف نسلوں سے بنگالی زبان بولنے والے کو بنگالی قوم کا فرد تصور کیا گیا۔ دنیا میں آنے والے انقلابات میں چاہے سیاسی و معاشی وجوہات موجود رہی ہوں ان انقلابوں میں ایک نعرہ قوم کی بنیاد پر بھی لگایا جاتا رہا ہے۔ قوم کا تصور ہر انقلاب میں بدل جاتا ہے۔ زری اور شمس دونوں خود کو الگ قوم کا فرد تصور کرتے ہوئے یکجہتی کا نعرہ لگاتے ہیں اور الگ قوم تصور کرتے ہوئے اپنی راہیں جدا کر لیتے ہیں۔ یہاں مصنفہ عہد خلجی کے ایک ترک النسل فوجی قاسم خاں کو دونوں کا جد امجد قرار دے کر دنیا میں کی گئی تقسیم پر سوال اٹھاتی ہیں۔ نسلوں کو اجداد سے ملنے والی وراثت کے متعلق لکھتی ہیں۔

نسلیں آتی رہیں گی، نسلیں جاتی رہیں گی، ایک نسل دوسری نسل کو اتنا کچھ دیتی ہے جس کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اصل وراثت تو وہی ہوتی ہے جو جینز (Jenes) سے منتقل ہوتی ہے جس سے انسان کی زندگی، اس کی تقدیر بنتی ہے۔10

مصنفہ نے جن علاقوں کو اپنی کہانی کا حصہ بنایا ہے وہاں کے کلچر و ثقافت کی پیش کش کو بھی یقینی بنایا۔ بنگال کے خوب صورت علاقے کی تصویر کشی اس کے ساتھ وابستہ قدرتی وسائل کے ساتھ کی ہے۔ بنگالیوں کی توہم پرستی جس سے ہم آج بھی بنگالی بابا کے کرشموں کی صورت میں متعارف ہیں کو خلجی عہد کی جادوگر دادی کے کردار سے ظاہر کیا ہے۔ قبائلی علاقوں اور شمالی علاقوں کی مہمان نوازی سمیت دیگر روایات کا بھی تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ نیز مختلف شہروں اور تاریخی مقامات کے ذکر سے کہانی میں حقیقی رنگ ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کی کہانی کا مرکزی موضوع مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علیحدگی ہے مگر مصنفہ نے اسے صرف اس ایک تاریخی واقعہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات، راشد منہاس کی شہادت جیسے اہم واقعات کا بھی ضمنی طور پر ذکر کر دیا ہے۔

مخصوص عہد کی سیاسی و سماجی صورت حال کو زیرِ بحث لاتے ہوئے یہ ناول اپنے اسلوب کے حوالے سے قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ناول کے کرداروں کی اکثریت تعلیم یافتہ ہے اس لیے ان کی زبان بھی شائستہ ہے۔ موقع کی مناسبت سے شامل کیے گئے بنگلہ کے لفظ، فقرے یا گیتوں کے ٹکڑے اثر پذیری میں اضافہ کرتے ہیں۔ رضیہ فصیح کا قلم جامعیت کے فن سے باخوبی آشنا ہے۔ انھیں اپنا نظریہ پیش کرنے کے لیے کرداروں کی زبان سے لمبی لمبی تقریریں نہیں کروانی پڑتیں۔ بعض اوقات ایک فقرے یا چند سطروں سے طویل خطاب کا کام لے لیتی ہیں جیسے زری کے شمس کو لکھے گئے چند سطروں پر مشتمل خط کے توسط سے پورے ناول میں عورت کے ساتھ ہونے والی معاشرتی ناانصافیوں کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

ناول "صدیوں کی زنجیر" کا مرکزی موضوع سقوط ڈھاکہ کا سانحہ ہے مگر ناول نگار نے اس سانحے کے مطالعہ کے لیے نسلوں اور صدیوں کے مابین ایک ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے بختیار خلجی کی مہم جوئی کے دور سے اس خطے کے حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے قیامِ پاکستان کے وقت کے تصور، قوم اور موجودہ حالات سے ان کے تعلق کو جوڑا ہے۔ اجتماعی قتل، اجتماعی زنا اور اجتماعی قبروں پر مٹی ڈال کر بڑھنے والے اس تاریخی انقلاب کو بھی کھنگالا ہے کہ جس خوش حالی کے خواب میں مغربی پاکستان سے رشتہ توڑا تھا وہ اہلِ بنگال کو اس کے بعد بھی نصیب نہ ہوئی۔ سیاسی لیڈروں نے اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے بعد عوام کو غربت اور بھوک کے اندھیروں میں سسکنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری جانب مغربی پاکستان کی عوام خوش فہموں کی جنت کی باسی معلوم ہوتی ہے جو حادثے کے رونما ہو جانے کے بعد بھی بنگالیوں کی اشتعال کی حد تک بڑھی ہوئی نفرت سے ناواقف نظر آتی ہے۔ مصنفہ نے ان کے لیے اصحاب کہف کی تلمیح استعمال کی ہے۔

ناول میں مصنفہ کا نظریہ ناول نگاری بھی موجود ہے۔ ناول کا کردار عمر خاں ایک ناول لکھنے میں مصروف نظر آتا مگر ہمیشہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ناول کبھی پوری طرح مکمل نہیں ہو سکتا کیونکہ تاریخ کے کسی بھی لمحے پر انسانی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں پر فل سٹاپ نہیں لگایا جا سکتا۔ مصنفہ نے بھی ناول کے اختتام پر زری کے پاس بند خط کی موجودگی سے اس کی زندگی میں آنے والی کسی نئی تبدیلی کی نوید سنائی ہے مگر وہ تبدیلی کیا ہو گی۔ اس کے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں دیا۔ ناول کے اختتام پر ایک مثبت فضا تشکیل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ الم ناک حادثات سے گزرنے کے باوجود انھوں نے کرداروں کو مضبوطی سے حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی جگہ کھڑے دکھایا ہے۔

یہ ناول سقوط ڈھاکہ کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں ممیز مقام کا حامل ہے۔ اس ناول میں مصنفہ کا سیاسی و سماجی شعور بھرپور انداز میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے ناول کے کرداروں کی تعمیر بہت محنت سے کی ہے۔ ان کے کرداروں کے رویوں اور مکالموں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتی۔ وہ سیاسی تبدیلیوں کے سیل میں بہہ تو جاتے ہیں مگر ان کی ترجیحات واضح ہیں۔ ناول وسیع کینوس پر مشتمل ہے مگر اس میں کہیں بھی غیر ضروری پیچیدگیاں یا گنجلک پن نظر نہیں آتا۔ یہ ناول افراد کی نجی زندگی کی محبتوں، معاشرتی زندگی کی نارسائیوں اور سیاسی تبدیلیوں سے آنے والی تباہی کی داستان ایک ساتھ سناتا ہے۔

حوالہ جات

1. غلام محی الدین انصاری سالک، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار،) نئی دہلی: شاہد پبلی کیشنز، 2008ء)، ص124
2. زاہدہ حنا، ایک ہمہ جہت تخلیقی شخصیت، https://www.express.pk/story/544695/، بدھ 29 جون 2016ء
3. ولی محمد، ڈاکٹر، سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب۔۔۔ صدیوں کی زنجیر کی روشنی میں، مشمولہ خیابان، شمارہ36 (پشاور، پشاور یونی ورسٹی، بہار 2017) ص80
4. صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا (لاہور: الفیصل پرنٹرز، 2017ء) ص، ۲۳
5. http://irs.org.pk/focus/focus-1-15.pdf.THE ROAD TO PAKISTAN'S DISMEMBERMENT: 1971 MARYAM MASTOOR .page.12
6. رضیہ فصیح احمد، دوناول: صدیوں کی زنجیر، یہ خواب سارے (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۳۳
7. ایس۔ کے۔ جبیں، ڈاکٹر، اردو کی خواتین ناول نگار (پٹنہ: ارم پبلشنگ ہاؤس، 2009ء)، ص170
8. رضیہ فصیح احمد، دوناول: صدیوں کی زنجیر، یہ خواب سارے (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۵ء)، ص45
9. ایضاً، ص ۵۸۵، ۵۸۴
10. ایضاً، ص ۶۳۳